امتیاز علی تاج

زندگی کی یہ ادا بھی نرالی ہے کہ بعض صدمے غیر متوقع طور پر سہنے پڑتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض مسرتیں اچانک نمودار ہو جاتی ہیں۔ اس کیفیت میں کچھ ایسی بے ساختگی ہوتی ہے کہ انسان یہ سوچنے کے قابل نہیں رہتا کہ یہ صدمہ کیوں پہنچا یا یہ مسرت کیسے آئی، تاہم یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ رنج اور صدمے بھی روح کی رونق اور تازگی کے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ضروری راحتیں اور مسرتیں۔ ویسے یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ رنج یا خوشی کا احساس ہمیں باہر سے کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ کیفیتیں تو ہمارے اندر پیدا ہوتی ہیں، اندر ہی پرورش پا کر جوان ہوتی ہیں اور اندر ہی فنا ہو جاتی ہیں۔ گویا یہ اضافی کیفیتیں ہیں جن کی بنیاد دیرپا نہیں ہوتی۔ خود انسانی دماغ و ذہن بھی قدرت کا ایک عجوبہ ہے۔ ناپائیداری کے اعتبار سے یہ بڑے سے بڑا صدمہ اور بڑی سے بڑی خوشی دونوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے کلام میں جا بجا اس فلسفے کو بیان کیا ہے۔ کہیں وہ غم کو خوشی سمجھتا ہے کہیں خوشی کو غم۔ مگر ان کی ناپائیداری کا وہ بھی قائل ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

سید امتیاز علی تاج کی مرگ ناگہاں بھی ایسا ہی صدمہ تھا جو مجھے اور میری طرح بے شمار اُن لوگوں کو غیر متوقع طور پر سہنا اور برداشت کرنا پڑا جو مرحوم سے زندگی میں کبھی مل چکے تھے یا انہیں برت چکے تھے۔ ایک لحظے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے موت بڑی ظالم ہے۔ بھلا سید صاحب جیسی مرنجاں مرنج اور شریف ہستی سے اسے کیا کد ہو سکتی تھی کہ رات کی تاریکی میں خنجر سے یوں ان پر وار کیا؟ سید صاحب خود کسی کے دشمن تھے نہ ان کا کوئی دشمن تھا۔ وہ تو سراپا محبت اور اخلاص تھے۔ ان میں کسی سے دشمنی کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر سید صاحب کا کوئی دشمن تھا تو آخر اس دشمن کا بھلا دوست کون ہو گا؟ پھر موت نے ان کے

ساتھ بے رحمی کا ثبوت کیوں دیا؟ اس کا کوئی جواب کسی کے پاس نہیں ہے تاہم یہ راز ضرور کھل گیا کہ موت جس قدر یقینی ہے، زندگی اتنی یقینی نہیں۔

۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء کا اخبار یہ خبر وحشت اثر لے کر آیا کہ ۱۸ اور ۱۹ اپریل کی رات دو نامعلوم افراد نے تاج صاحب کو قتل کر دیا۔ تفصیلات بڑی اندوہناک تھیں .... انہیں دوہرانا لاحاصل ہے۔ خبر دیکھنے کے باوجود دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ سید صاحب، جو چند روز قبل مجھ سے ملے تھے، ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور مجھے اپنے دفتر میں آنے کی سخت تاکید کر گئے تھے، اب قیامت میں ملیں گے۔

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

یادوں کا ایک قافلہ آہستہ آہستہ آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگا۔ احساس ہوا کہ مرنے والے کے ساتھ غیر شعوری طور پر کیسی اپنائیت اور محبت تھی۔ روح کے ساتھ اس کا کیسا رشتہ استوار تھا کہ زندگی کی محفل سے اس کے یوں اُٹھ جانے سے ایسا لگا جیسے تمام چراغ یکا یک گل ہو گئے ہوں وراب اس بے پناہ تاریکی اور سناٹے کو دور کرنے کا کوئی سامان کسی کے پاس نہ ہو۔

تاج کا نام بچپن ہی سے کانوں میں پڑ چکا تھا۔ تعارف کا یہ ذریعہ ان کا ہفتہ وار 'پھول' تھا جو باقاعدگی سے سردار دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر ریاست دہلی کے دفتر میں آتا۔ سردار جی اسے بڑی باقاعدگی سے ڈاک میں سے الگ کر کے رکھ لیتے اور جب ہم کھیلتے کودتے ہوئے ان کے دفتر میں جاتے تو وہ پھول اُٹھا کر ہمارے حوالے کر دیتے۔ آٹھ صفحوں کا یہ رسالہ جس میں پن کبھی نہیں لگائی جاتی تھی، اس زمانے میں ہمارا محبوب تھا۔ سردار جی کبھی کبھار ہمارے اس محبوب کو کسی اور کے حوالے کر دیتے یا کوئی ان سے چھین لے جاتا تو ایک آفت آ جاتی۔ رقیب بھی پھول کی گھات میں رہتے۔ خاصی چھینا جھپٹی ہوتی اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ آدھا پرچہ ہمارے ہاتھ میں رہ جاتا اور آدھا رقیبوں میں سے کوئی لے بھاگتا۔

پاکستان بنا۔ ہم دلی سے نکلے، لاہور آئے تو پھول کے بہت سے پرچے حرزِ جاں بنا کر ساتھ لائے۔ ایک ہم جماعت اور عزیز دوست نے یہ نیکی کی کہ پنجاب پبلک لائبریری کا راستہ دکھایا۔ یہاں بھی تاج صاحب کے پھول سے ملاقاتیں رہنے لگیں۔ پھر ایک ایک کر کے ان کی

تمام وہ کتابیں پڑھ ڈالیں جن کے ٹائٹل سنہرے رنگ کے تھے اور جن پر پیسے کی تصویر چھپا کرتی تھی۔ جنوں کی کہانیاں، ڈاکوؤں کی کہانیاں، بھوتوں کی کہانیاں، بہادروں کی کہانیاں وغیرہ۔ یہ پیسہ لائبریری کی کتابیں تھیں۔ ہر کتاب کے مصنف سید امتیاز علی تاجؔ تھے۔ پھر چچا چھکن سے تعارف ہوا اور چچا چھکن کے ساتھ ساتھ تاج صاحب بھی پیارے لگنے لگے۔ ریڈیو پر ان کے ڈرامے بھی سننے کا موقع ملا۔ نظر ذرا وسیع ہوئی تو ان کے شہرۂ آفاق ڈرامے ''انار کلی'' کا مطالعہ کیا۔ محبت کے ساتھ ساتھ اب تاج کی عظمت بھی دل میں سما گئی۔ بارہا ان کے بارے میں سوچا، ان کا نقشہ ذہن میں جمانے کی کوشش کی کہ کیسے ہوں گے تاج صاحب۔ ایک دو بار جوشِ اشتیاق میں دارالاشاعت پنجاب کے دفتر ریلوے روڈ پر جانے کی بھی ہمت کی مگر تاج کو دیکھنے اور ملنے کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ کئی برس گزر گئے۔ زندگی کے ہنگاموں اور فکرِ معاش کے جھنجھٹوں نے ایسا گھیرا کہ تاج صاحب کا خیال اور ان کی یاد دُھندلا گئی۔

غیر متوقع مسرتیں کیوں کر نمودار ہوتی ہیں، ان کا ذکر بھی سن لیجئے۔ سال ۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء کا تھا۔ اب صحیح یاد نہیں آرہا۔ شاید اس سے بھی پہلے ہو۔ مال روڈ پر شام کے وقت ماموں اُجو سے ملاقات ہوگئی۔

ہائے کیا خوب آدمی تھے یہ ماموں اُجو بھی.....

اپنی ذات میں اک چلتی پھرتی انجمن.......ایسے چرب زبان اور لسان آدمی زندگی میں بہت کم دیکھے۔ آدمی کیا، قیامت تھے۔ بڑے بڑوں کی زبانیں ان کے سامنے کھلتی نہ تھیں۔ دلی کے آخری داستان گو میر باقر علی کے عزیزوں میں تھے۔ غالباً نواسے۔ باقاعدہ تعلیم کچھ نہ تھی مگر گفتگو سے کوئی اندازہ نہ کرسکتا تھا کہ کورے ہیں۔ نام سید اصغر حسین، شہر بھر میں ماموں اُجو کے نام سے معروف تھے۔ دنیا کا کوئی کام ان کی لغت میں ناممکن نہ تھا۔ آسمان میں تھگلی لگاتے، اُڑتی چڑیا کے پر گنتے۔ مٹھی میں ہوا کو تھامتے۔ بس ایسے آدمی تھے ماموں اُجو.....اس زمانے میں فلمی دھندوں میں پڑ گئے تھے۔ صبح شام اُن کا زیادہ وقت دفتر ''ڈائریکٹر'' میں گزرتا تھا۔ مجھے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ابھی جا کر بیٹھے ہی تھے کہ شوکت تھانوی آگئے۔ ان کا وہاں آنا ایک ہنگامے سے کم نہ تھا۔ ماموں اُجو اور شوکت مرحوم میں فقرے بازی شروع ہوئی۔ شوکت سیر تھے ماموں سوا سیر۔ معاملہ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی کی بلندی سے اُتر کر فحش کلامی

کی پستی میں اُتر آیا۔

آخر شوکت صاحب نے ٹیلیفون گھما کر کسی سے بات کی اور کہا: گاڑی جلدی بھیج، میں تیار ہوں۔ پندرہ بیس منٹ بعد گاڑی آئی۔ شوکت صاحب نے ماموں اَجو سے کہا:

''اُٹھو بیٹا، اب اسٹوڈیو چل کر تمہاری مرمت ہو سے کراؤں گا۔''

گاڑی میں جگہ خاصی تھی، میں بھی دھنس گیا۔ شاہ نور اسٹوڈیو پہنچے۔ معلوم ہوا کہ سیٹ تیار ہے۔ فلم ''گلنار'' کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اس میں شوکت تھانوی ہیروئن، نور جہاں کے باپ کا کردار ادا کر رہے تھے۔ کہانی لکھنوی تہذیب کے گرد گھومتی تھی۔ مشہور ایکٹرس عشرت ببو[ا] اس فلم میں شوکت صاحب کی بیوی کا رول ادا کر رہی تھیں۔ خود شوکت صاحب لکھنوی نواب بنے ہوئے تھے۔ 'بہو' بڑی طرار اور زبان دراز خاتون تھیں۔ انہوں نے شوکت اور ماموں اَجو دونوں کو فقروں پر دھر لیا۔ اتنے میں غل مچا کہ تاج صاحب آ گئے۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ شوکت رضوی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ایک صاحب خراماں خراماں ہماری طرف آ رہے تھے۔ نکلتا ہوا قد، سرخ و سپید چہرہ، سرمئی رنگ کا سوٹ، ٹائی اسی رنگ سے میل کھاتی ہوئی، سر پر جناح کیپ، آنکھوں پر قیمتی سنہری کمانیوں کا چشمہ، ڈاڑھی مونچھ صاف، لبوں پر ایک دل فریب تبسم۔ قریب آئے۔ سب نے اُٹھ کر تعظیم دی۔ شوکت صاحب کچھ سراسیمہ سے دکھائی دیئے جیسے تاج کا احترام ان پر حاوی ہو گیا ہو۔ تاج صاحب نے ہنس کر ان سے کہا:

''بچ رہے ہو یار علامہ اس لباس میں.........''

شوکت صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

''تاج صاحب خدا کے لیے 'علامہ' کے ساتھ 'یار' کہہ کر اس لفظوں کو رسوا نہ کیا کیجئے۔''

سب نے قہقہہ لگایا اور گفتگو کا رُخ فلم کی طرف مڑ گیا..... چوٹیں تاج صاحب سے بھی چلیں، شوکت صاحب کی بھی اور ماموں اَجو کی بھی ...... لیکن میں نے دیکھا کہ اس میں رکھ رکھاؤ اور احترام کا جذبہ نمایاں تھا۔ بدتمیزی اور بیہودگی ہرگز نہ تھی۔ تاج صاحب کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ کوئی شخص آسانی سے ان کے سامنے بے تکلف نہ ہو سکتا تھا۔

مجھے خوب یاد ہے اس محفل میں تاج صاحب کے کسی بے پناہ جملے سے پھڑک کر شوکت

مرحوم نے اپنا چمڑے کا بیگ کھولا۔ چند کاغذ نکالے اور کہا:

''آج کل میں ایک قاعدہ لکھ رہا ہوں جو بے قاعدہ ہے اور اس کا آغاز میں نے آپ سے کیا ہے یعنی الف سے امتیاز علی تاج، ب سے بشیر احمد میاں اور پ سے پطرس بخاری۔ خدا کے لیے چند سطریں سن لیجئے، بعد میں مجھ سے گلہ نہ کیجئے گا۔''

یہ سن کر سب انتہائی دلچسپی سے شوکت صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شوکت صاحب نے پہلا سبق سنایا یعنی ''الف سے امتیاز علی تاج''۔ چند سطریں تھیں لیکن میں نے دیکھا کہ تاج صاحب ضبط کرنے کے باوجود اس قدر ہنسے کہ ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شوکت صاحب کا یہ قاعدہ بے قاعدہ بعد میں چھپ گیا۔ لیجئے آپ بھی پہلا سبق دیکھئے:

''دیکھو بچو! یہ امتیاز علی تاج ہیں...... امتیاز علی ان کا نام ہے اور تاج تخلص، مگر شعر نہیں کہتے تا کہ تخلص خرچ نہ ہو جائے اور تخلص اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا کا کیا بھروسا، نہ جانے کب شعر کہنے پڑ جائیں۔ پہلے یہ ڈرامے پڑھتے تھے پھر ڈرامے لکھنے لگے۔ جب لاہور میں ریڈیو ایجاد ہوا تو ڈرامے سنانے لگے۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ لاہور میں فلم کمپنیاں اُگنے لگیں تو تاج صاحب ڈرامے دکھانے بھی لگے۔ اب ڈرامے کھلانا اور ڈرامے پلانا باقی رہ گیا ہے، مگر لاہور بھی ترقی کر رہا ہے اور سائنس بھی..... وہ دن بھی آ ہی جائیں گے۔''

جب ہنسنا ہنسانا ذرا رکا تو تاج صاحب نے سنجیدگی سے کہا:

''یار علامہ تم نے ٹھیک لکھا۔ مگر ایک زمانے میں میں شعر بھی کہتا تھا اور میری نظمیں چھپتی بھی تھیں۔ پھر والد صاحب نے شعر گوئی سے منع کر دیا۔ لہٰذا تمہارا یہ کہنا درست نہیں کہ میں شعر نہیں کہتا۔''

ان سطور کا لکھنے والا اُس زمانے میں بھی گمنام تھا، آج بھی ہے۔ تاج صاحب کو دیکھ لینا ہی اُس وقت خوشی کی معراج تھی اور بہت دن تک اس کا سرور رہا۔ پھر کئی برس گزر گئے۔ اس دوران میں شوکت مرحوم سے مراسم بڑھ گئے تھے۔ ان کی بے تکلفی اور شفقت کی وافر مقدار

میرے حصے میں آ گئی تھی جس کا ذکر پھر کبھی کروں گا۔ کہنا یہ ہے کہ ماموں اُجو اور شوکت تھانوی، دو بے تکلف دوست آگے پیچھے، اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ماموں اُجو جو غالباً ۱۹۶۱ء میں اور شوکت صاحب ۱۹۶۲ء میں۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کا آغاز تھا۔ مشرقی پاکستان سے رابطہ ٹوٹ جانے کے باعث پانوں کی آمد بند تھی اور مغربی پاکستان میں پانوں کے رسیا طرح طرح کے پتے چبا کر طلب بجھا رہے تھے۔ ایک روز دوپہر کو لاہور کی پان گلی کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ پان خوروں کی ایک لمبی قطار دکھائی دی۔ کسی کے پاس پان کا ذخیرہ تھا اور وہ ہر گاہک کو ایک روپے میں ایک پتا دے رہا تھا۔ یکا یک میرے قدم زمین نے تھام لیے۔ میں نے دیکھا کہ اس قطار میں کم از کم دو آدمی ایسے ہیں جنہیں میں پہچانتا ہوں۔ کون؟ ایک سید امتیاز علی تاج، دوسرے ناصر کاظمی ....ناصر کاظمی مرحوم زندگی سے بیزار تھے۔ ان سے تعارف تھا۔ میں قریب گیا۔ مجھے دیکھ کر شرمائے، کچھ جھینپے میں مسکرا دیا۔ خود ہی کہنے لگے:

''یار کیا کروں، مجبور ہوں.....ریڈیو والوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ روز ایک نیا ترانہ مانگتے ہیں۔ بھلا پتے کھا کر بھی کوئی شریف آدمی تخلیقی کام کر سکتا ہے۔ لعنت ہے اس زندگی پر۔''

میں نے ان کے کان میں کہا:

''گھبرایئے نہیں۔ آپ سے زیادہ اونچی حیثیت کے فن کار قطار میں کھڑے ہیں۔ ذرا کنکھیوں سے پیچھے دیکھئے۔''

ناصر مرحوم نے کنکھیوں سے دیکھنے کے بجائے پوری گردن گھما کر دیکھا:

''ارے تاج صاحب کھڑے ہیں۔ غضب ہو گیا۔''

یہ جملہ ناصر کاظمی نے اس انداز سے ادا کیا جیسے تاج صاحب کا قطار میں کھڑا ہونا ان کے لیے سخت ذہنی اذیت کا باعث ہوا ہو۔ پھر انہوں نے بے چارگی سے کہا:

''تاج صاحب طلب کے ہاتھوں مجبور ہوئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کی باری آنے تک پان ختم ہو جائیں گے۔''

اب اس صورتِ حال کی نزاکت کو میں نے محسوس کیا۔ سامنے ہی جیلانی کا چھوٹا سا

بک اسٹال تھا۔ میں اس کے پاس گیا۔ پان والوں سے جیلانی کے تعلقات آڑے آئے۔ مجھے چپکے سے دس پان کاغذ میں باندھ کر دے دیے گئے۔ ناصر کاظمی نے انہیں سلام کیا۔ قطار سے الگ لے جا کر پان پیش کیے۔ پھر میرا تعارف کچھ مبالغہ آمیز فقروں سے کرایا۔ تاج صاحب نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا:

''آپ کا یہ احسان سر آنکھوں کے بجائے انشاءاللہ کام و دہن میں رہے گا۔''

ان کا یہ فقرہ آج تک کانوں میں گونجتا ہے۔

پھر کئی برس بیت گئے۔

۱۹۶۹ء کا ذکر ہے۔ عیدالفطر کی مبارک باد کا کارڈ میں نے تاج صاحب کو بھیج دیا۔ چند روز بعد ان کا خط ملا۔ انہوں نے مجھے فوراً ملنے کی ہدایت کی تھی۔ میں مجلس ترقی ادب کے دفتر میں حاضر ہوا۔ برادرم حنیف شاہد اُن دنوں پبلک لائبریری میں مشرقی شعبے کے انچارج تھے۔ وہ بھی میرے ہمراہ تھے۔ کلب روڈ کی اس پُرسکون فضا میں مجلس ترقی ادب کے دفتر میں آنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ حضرت گوہر نوشاہی نے بتایا کہ تاج صاحب آنے ہی والے ہیں۔ ہم ان کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد تاج صاحب تشریف لے آئے۔ نہایت شفقت اور محبت سے ملے اور چھوٹتے ہی کہا:

''میں نے کئی بار آپ کے بارے میں سوچا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ آج کل فارغ ہیں۔ اردو ڈائجسٹ سے آپ الگ ہو گئے۔ میں آپ کے مضامین شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ کہیے اب کیا ارادے ہیں؟''

میں نے انہیں اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ غور سے سنتے رہے۔ پھر فرمایا:

''مجلس کے لیے کچھ کام کیجیے۔ ہے کوئی چیز ذہن میں؟''

میں نے عرض کیا: ''اس قابل تو نہیں ہوں، جو آپ فرمائیں کروں۔''

انہوں نے چند کتابوں کے نام لیے کہ اگر انہیں ایڈٹ کروں تو اچھا ہے۔ ان میں سے ایک ثابت لکھنوی مرحوم کی کتاب ''حیاتِ دبیر'' بھی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ اس کا صرف ایک نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں تھا، اب وہ بھی غائب ہے۔ فرمایا:

''اس کا ایک نسخہ عابد علی عابد کے پاس ہے۔ میں ان سے حاصل کر کے آپ کو دوں گا۔

ابتدا اس کتاب سے کیجئے۔''

دیر تک گفتگو رہی۔ میں نے کہا کسی روز غریب خانے پر تشریف لایئے۔ چند لمحے تامل کیا، پھر کہنے لگے: ضرور آؤں گا۔ ابھی چند روز ہوئے مری سے واپس آ رہا تھا کہ راہ میں حادثہ ہوا۔ میرے گھٹنے پر چوٹ لگی ہے۔ ابھی تکلیف ہے چلا نہیں جاتا۔ ٹھیک ہو جاؤں تو آؤں گا۔

اپنی مصروفیات کا ذکر کیا اور بتایا کہ آج کل اردو کے کلاسیکی ڈرامے جمع کر رہا ہوں۔ تیس جلدیں ہوں گی۔ ابتدائی چھ جلدیں چھپ رہی ہیں۔ آپ کو دوں گا۔

میں ایسا بدنصیب کہ پھر تاج صاحب کے دفتر میں نہ جا سکا اور کاموں میں پھنس گیا۔ سیارہ ڈائجسٹ کے شعبۂ ادارت سے منسلک ہوا۔ اس دوران میں کئی بار تاج صاحب یاد آئے مگر فطری کاہلی کے باعث یہی سوچتا رہا کہ ایسی جلدی کیا ہے۔ کسی بھی روز جا کے مل لوں گا۔

اپریل ۱۹۷۰ء کی ۱۴، ۱۵ تاریخ تھی۔ دھنی رام روڈ پر شام کے وقت ایک دوست کی دکان پر بیٹھا تھا کہ تاج صاحب کو دیکھا۔ گھبرائے ہوئے سامنے سے نکل گئے۔ تنہا تھے۔ چند منٹ بعد پھر واپس آئے۔ غرض کئی بار آئے گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ کہنے لگے:

تم کہاں؟

میں نے پوچھا: آپ کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں کیا؟

فرمایا: ''میاں میرے ساتھ ایک خاتون شاپنگ کے لیے آئی تھیں۔ میں ایک دوست سے باتوں میں لگ گیا۔ وہ خاتون خدا جانے کس دکان میں گھس گئیں۔ مجھے ایک تقریب میں بھی پہنچنا ہے اور ان کا پتہ نہیں چل رہا۔''

ہم دونوں نے بازار کا چکر لگایا..... وہ خاتون ایک دکان سے برآمد کی گئیں۔ تاج صاحب نے موٹر میں بیٹھتے ہوئے کہا:

''بھئی معاف کرنا جلدی میں ہوں۔ اور ہاں، تم مجھ سے ایک دو روز میں ضرور مل لو۔ دفتر میں صبح دس بجے کے بعد۔''

اور وہ رخصت ہو گئے۔ ہمیشہ کے لیے۔

دو دن بعد ہی ان کی سناؤنی آ گئی۔ آج تک ان کا قتل ایک معما ہے۔

جون کا آخری ہفتہ تھا۔ میں سیارہ ڈائجسٹ کے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ چپراسی نے بتایا مجلس ترقی ادب سے ایک آدمی آیا ہے، ملنا چاہتا ہے۔ معاً تاج صاحب یاد آ گئے۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ وہ آدمی آیا۔ اس کے ہاتھ میں کتابوں کا ایک پیکٹ تھا۔ کتابیں اس نے میز پر رکھ دیں۔ ایک کاغذ آگے بڑھایا:

اس پر دستخط کر کے کتابیں لے لیجئے..... میں نے تعمیل کی۔ پیکٹ کھولا۔ اردو کلاسیکی ڈراموں کی چھ کتابیں تھیں جنہیں سید امتیاز علی تاج نے مرتب و مدون کر کے شائع کیا تھا۔

''یہ کتابیں ریویو کے لیے لائے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس شخص نے نفی میں گردن ہلائی اور آہستہ سے کہا:

> ''یہ کتابیں تاج صاحب اپنے دوستوں کو دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے مرنے سے پہلے فہرست بنالی تھی اور دفتر کو ہدایت کی تھی کہ ان تمام حضرات کو ایک ایک سیٹ بھجوا دیا جائے۔ اس فہرست میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ دفتر نے یہ کتابیں آپ کو ریویو کے لیے نہیں، تاج صاحب کی طرف سے بطور تحفہ ارسال کی ہیں۔''

میری آنکھیں جو چند لمحے پہلے آنسو پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں، بے اختیار اُبل پڑیں۔

□□□

حاشیہ:

[۱]۔عشرت سلطانہ المروف ببو کا تذکرہ موسیقار اعظم نوشاد صاحب نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ مذکورہ خودنوشت کا پاکستانی ایڈیشن اٹلانٹس نے یکم فروری ۲۰۱۷ء میں شائع کیا ہے۔ اس کے حواشی میں راقم نے جو لکھا ہے وہ یہاں پیش خدمت ہے:

'آؤٹ آف ڈیٹ' میں لقمان اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''زینت میں ببو، ہیرو کی ماں کا رول کر رہی تھی۔ اس وقت اس کی شادی ذوالفقار علی بھٹو کے بڑے بھائی امداد علی بھٹو سے ہو چکی تھی بلکہ خاوند کی اجازت سے وہ کام

کر رہی تھی۔ رہتے تھے وہ تاج محل ہوٹل میں۔ دولت مند آدمی تھا۔ باپ جونا گڑھ میں وزیر اعظم تھا۔ ویسے بھی رئیس تو تھے وہ۔ دو، دو گارڈ ساتھ ہوتے تھے۔ ان کی ایک کوٹھی والکیشر میں تھی جہاں ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی والدہ رہتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ ذوالفقار علی بھٹو اور سکندر علی بھٹو، ببو کے ساتھ سیٹ پر بھی آئے۔ سکندر علی بھٹو اور امداد علی بھٹو دونوں سگے بھائی تھے۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو بہت ینگ تھے۔ اٹھارہ انیس کے ہوں گے۔ ۱۹۴۶ء کی بات کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں تنگ موری کی پتلون چلتی تھی۔ وہ انہوں نے پہنی ہوتی تھی اور لمبے لمبے بال ہوتے تھے۔ اس کے بعد سنا کہ یہ نرگس پر عاشق ہو گئے اور میرین ڈرائیو پر، میرین شیٹو کے سامنے بنی پر یہ رات کو دو دو بجے تک بیٹھتے ہیں۔ جدن بائی نے یہ شکایت ببو سے کی۔ ببو نے امداد علی بھٹو سے کہا۔ اس نے کہا کہ مجھے دکھاؤ۔ ببو نے جدن بائی سے کہا کہ جس وقت وہ آئے تم مجھے فون کر دینا، امداد خود دیکھنا چاہتے ہیں۔ چوپاٹی سے اوپر والکیشر شروع ہو جاتی ہے جہاں بھٹو صاحب کا بنگلہ تھا۔ جب یہ آئے تو گھنٹے دو گھنٹے انہوں نے دیار یار پر بیٹھنا ہی تھا۔ جدن بائی نے ٹیلی فون کر دیا۔ امداد نے ببو کو ساتھ لیا اور پہنچ گئے۔ موقع پر پکڑ لیا۔ ساتھ لے گئے۔ پھر ببو نے بتایا کہ کافی پٹائی وٹائی کی اور فوری طور پر انہیں باہر بھیجنے کا بندوبست کیا۔ باپ سے مشورہ کر لیا ہوگا۔ اس زمانے میں ان کے والد جونا گڑھ میں وزیر اعظم تھے۔ ان کے عشق کا چرچا کچھ دیر انڈسٹری میں رہا۔ چھوٹا موٹا عشق تو تھا نہیں۔ جب پاکستان بن گیا تو ببو بھی پاکستان آ گئی۔ وہ امداد علی بھٹو کے پاس لاڑکانہ میں رہی ہے۔ اس کے مرنے کے بعد پھر ببو نے فلموں میں کام شروع کر دیا۔''

علی سفیان آفاقی کے مطابق ببو بے اولاد تھی۔ زندگی کے آخری سال اس نے اپنے جاننے والوں کے گھر کاٹے۔ اگلے وقتوں میں لاکھوں کمائے اور لاکھوں ہی لٹائے۔ بہت کسمپرسی میں اس کا انتقال ہوا۔

☆☆☆